اسلام دین عمل

تقریر (بتاریخ ۱۱ر نومبر ۱۹۷۷ء ۹ر بجے شب، فیض آباد)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ اَبِى الۡقَاسِمِ مُحَمَّدٍ خَاتِمِ النَّبِيّيۡنَ. وَاٰلِهِ الطَّيِّبِيۡنَ الطَّاهِرِيۡنَ الۡمَعۡصُوۡمِيۡنَ.

اَمَّا بَعۡدُ

فَقَدۡ قَالَ اللّٰهُ سُبۡحَانَهٗ فِى كِتَابِهِ الۡمُبِيۡنَ وَهُوَ اَصۡدَقُ الصَّادِقِيۡنَ.

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

يَوۡمَئِذٍ يَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ. وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ.

قرآن مجید کے تیسویں پارے میں مختصر ترین تو نہیں، مگر مختصر سوروں میں "سورہ زلزال" ترتیب قرآنی میں سورۂ عادیات سے پہلے ہے۔ اسی میں کی دو آیتیں ہیں جن کو میں نے عنوان کلام قرار دیا ہے۔

ارشاد ہو رہا ہے:

اس دن گروہ گروہ جماعتیں انسانوں کی برآمد ہوں گی۔ تا کہ ان کے اعمال انھیں دکھائے جائیں، جس نے ذرّہ بھر بھی برا عمل کیا ہے وہ اسے دیکھے گا۔

''اعمال دکھائے جائیں گے''یعنی ہر ایک کے اعمال کا انجام اس کے سامنے آئے گا۔

میرا موضوع ''اسلام دین عمل ہے'' اس میں دو شعبے ہیں:

ایک شعبہ دنیاوی مقاصد کے لئے اور دوسرا اخروی مقاصد کے لئے چونکہ میرے بیان کے لئے دو مجلسیں ہیں اور موضوع وسیع ہے، اس لئے میں ان دونوں شعبوں کو دو مجلسوں پر تقسیم کرتا ہوں۔ اس وقت پہلا شعبہ عمل کا بیان کرنا ہے جو دنیا سے متعلق ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ دنیا سے ایک عالم دین کو کیا مطلب؟ مگر یہ کسی اور دین کا عالم ہو تو اس سے مطالبہ ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا سے مطلب نہ رکھے۔ لیکن جو کسی حد تک کہلاتا ہو ''دین اسلام کا عالم'' اس سے یہ مطالبہ درست نہ ہوگا کہ وہ دنیا سے الگ ہو جائے۔ اسلام نے دنیا کو اپنے دائرہ سے باہر نہیں رکھا تو ایک عالم اسلام کیونکر تلقین کر سکتا ہے کہ دنیا سے مطلب نہ رکھو۔ اگر کوئی یہ کہتا ہو کہ ہمیں دنیا کی ضرورت نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اسلام کا علم نہیں ہے۔

بے شک کلام امیر المومنینؑ میں کثرت سے دنیا کی مذمت ہے مگر وہ اس دنیا کی ہے جو مقابل دین ہے۔ ورنہ ہم میں سے کون ہے جو یہ کہے کہ ہمیں دنیا کی کامیابی کی ضرورت نہیں ہے؟

دنیا کے مفادات کیا ہیں؟ مال دنیا، عزت دنیا اور اولاد۔ ان میں سر دست مال دنیا ہی کے بارے میں عرض کرنا ہے۔

کوئی اظہار زہد و تقویٰ کے لئے کہے ہمیں مال کی ضرورت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں اوّل تو یہ صدا ہی کھوکھلی ہے۔ اگر پیسہ مل رہا ہو، پھر کہیں ہمیں ضرورت نہیں تو ایک بات ہے۔ ورنہ پھر عصمت بی بی، بے چادری کا مضمون ہے۔ لیکن اگر واقعی ذہنی طور پر کسی کو یہ تصور ہو کہ پیسے کی ضرورت نہیں ہے تو یہ تصور اسلام کے نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے اگر پیسے کا تصور نہ ہوتا تو قرآن میں تقریباً ہر جگہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا نام ایک ساتھ کیوں ہوتا حالانکہ واقعہ یہی ہے کہ جہاں جہاں صلوٰۃ کا ذکر ہے وہاں زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے۔

اسلام ''دین عمل'' ہونے کے ساتھ ''دین عقل'' ہے لہٰذا صاحبان عقل غور کریں کہ اس وقت ہمارا معاشرہ کیا ہے؟ شرائط زکوٰۃ کے لحاظ سے زکوٰۃ ہمارے یہاں کتنے آدمیوں پر واجب ہے۔ فیصدی شاید ایک ہو جس میں شرائط زکوٰۃ حاصل ہوں۔ نماز تو سب کو پڑھنا ہے اور زکوٰۃ دو ایک کو دینا ہے تو بلاغت قرآنی کا تقاضا یہ تھا کہ نماز کا حکم اگر سو جگہ پر ہو تو بس دو ایک جگہ زکوٰۃ کا بیان ہو لیکن قرآن میں تقریباً ہر جگہ صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم ہونا بتلاتا ہے کہ قرآن ایک ایسے سماج کی تشکیل چاہتا ہے جو مفلس اور قلاش نہ ہو۔ ایسا سماج جس میں ہر فرد پر جیسے نماز واجب ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی واجب ہو۔

ہاں اس ترقی یافتہ اور پھر سوشلزم وغیرہ کے تصورات سے متاثر دور میں کچھ لوگ فلسفۂ زکوٰۃ یہ قرار دیتے ہیں کہ زکوٰۃ کا حکم تو اسی واسطے ہے کہ پیسے زیادہ نہ ہونے پائیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر قوم کے پاس پیسہ کا نہ ہونا مدنظر ہوتا تو لینے والوں کو قوم کے اندر کیوں محدود کیا جاتا۔ حالانکہ مستحقین زکوٰۃ، فقراء و مساکین میں شرط ہے کہ وہ مومنین میں سے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ منظور نہیں کہ قوم کا روپیہ قوم کے اندر سے نکلے۔ مگر مطلوب یہ ہے کہ پیسہ ایک جگہ منجمد نہ ہو جائے جیسے خون تمام جسم میں گردش کرتا ہے اسی طرح پیسہ تمام قوم میں گردش کرتا رہے۔

پھر کوئی کہہ لے کہ پیسے کی مجھے ضرورت نہیں تو کیا روٹی کی بھی ضرورت نہیں ہے؟

بے شک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روٹی ذریعہ حیات یا مقصدِ حیات؟ اگر روٹی زندگی کا ذریعہ ہے تو اس کے بعد سوچنا ہوگا کہ مقصدِ حیات کیا ہے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ مقصد کا درجہ اونچا ہوتا ہے۔ تو اب بلحاظ اہمیت تین درجے ہوں گے۔ پہلے روٹی، دوسرے زندگی تیسرے مقصد زندگی تو جس طرح روٹی سے زندگی اہم، اسی طرح زندگی سے مقصدِ زندگی اہم ہے۔ جب روٹی زندگی کی خاطر ہے تو پھر ایسی روٹی جس کے کھانے سے ہیضہ ہو جائے، حاصل کرنے کے لائق نہ ہوگی۔ اور چونکہ زندگی سے بھی اہم اس کا مقصد ہے تو وہ روٹی بھی ترک کرنے کے قابل نہ ہوگی جو مقصد حیات

کونقصان پہنچائے مثلاً وہ روٹی جو کسی کی جان لے کر ملے یا وہ روٹی جو بے گناہوں کے گھر جلا کر ملے، وہ روٹی جو فتنہ وفساد برپا کر کے ملے، اس لئے چھوڑنے کے قابل ہوگی کہ وہ مقصد حیات کو نقصان پہنچاتی ہے اور یہیں سے رزق میں حلال وحرام کا فرق پیدا ہوگا اور جب روٹی کے نظام کے ساتھ جائز وناجائز کے امتیاز کی قید لگ جائے گی تو اس روٹی والے نظام سے اسلام گلے مل جائے گا۔

بہر حال روٹی کی ضرورت نا قابل انکار ہے مگر جس قوم کی عادت ہو۔بغیر محنت کے روٹی ملنے کی اور خواہش یہی ہو کہ بغیر محنت کے روٹی مل جائے اس کے یہاں ایسے تصورات تراش لئے جاتے ہیں اور کبھی صحیح تصورات کا غلط استعمال کیا جاتا ہے کہ محنت ومشقت کرنا نہ پڑے اور روٹی مل جائے چنانچہ مذہبی حلقہ میں سب سے پہلے ایک تصور بے عملی کو نبھانے کے لئے سامنے لایا جاتا ہے یہ کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ مٹتا نہیں ۔مقدر میں فاقے ہیں تو فاقے کرنا پڑیں گے اور کھانا ملنا ہے تو مل کر رہے گا۔محنت ومشقت سے کیا فائدہ؟

میں کہتا ہوں کہ کیا تقدیر کا مسئلہ صرف رزق کے معاملہ میں ہے؟ اگر آپ اس اصول کے قائل ہیں تو بچہ خدانخواستہ بیمار ہو تو ڈاکٹر کے یہاں نہ جایئے۔ اگر زندہ رہنا ہے تو رہے گا۔ڈاکٹر کے یہاں جانے سے کیا فائدہ؟

اگر کوئی مقدمہ عدالت میں ہو تو کسی وکیل کے پاس کیوں جایئے؟ اگر تقدیر میں ہوگا تو مقدمہ جیتئے گا ورنہ ہار جایئے گا۔

مگر ڈاکٹر کے یہاں جانا، دوا لانا، پھر شیشی کو حرکت دے کر دوا کا منھ تک پہنچانا۔ایک سلسلہ عمل کا ہے جس سے آپ بے نیاز نہیں ہیں۔مقدمہ میں وکیل یا بیرسٹر کے یہاں دوڑے، عدالت کے چکر لگائے، تمام ذرائع فراہم کئے ...... یہ سب کیا عمل کی منزلوں سے الگ ہے۔ان سب منزلوں سے گذرنے کے بعد نتیجہ کے حصول کا انتظار ہوتا ہے۔

دور کیوں جایئے۔اس وقت آپ مجلس میں آکر میرا بیان سن رہے ہیں تو دور دراز سے یا یہیں کہیں دور یا قریب سے، کسی سواری پر یا پیادہ راستہ طے کر کے آئے۔زیادہ یا کم جو دشواری پیش آئی اسے ٹالنے کی کوشش کی۔اس کی کیا ضرورت تھی۔آرام سے اپنے گھر میں رہتے، تقدیر میں ہوتا تو مجلس سن لیتے۔

یہ سب مشورے اگر کوئی دے اور تقدیر کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر دے تو آپ قبول نہ کریں بلکہ اس شخص کو شاید دیوانہ کہیں اور رزق کے معاملہ میں آپ تقدیر پر شاکر ہو کر سعی وعمل سے گریز کریں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ بعض اوقات اصل تقدیر یہی ہے کہ تم علاج کرو تو مریض اچھا ہو، تجارت کرو تو نفع ہو۔حضور والا ان تمام کوششوں کے بعد بھی مقصد حاصل نہ ہو، تب یہ کہنے کا حق ہے کہ ہماری تقدیر میں نہیں تھا۔

اب اگر سوال کیا جائے کہ دو طرح کی تقدیریں کیوں رکھی گئیں؟ میں کہتا ہوں مشروط تقدیر اس لئے رکھی کہ بے عملی پیدا نہ ہو اور کچھ تقدیریں مطلق اس لئے رکھیں کہ تم خدا کو نہ بھولو اور اپنے ہی کو خدا نہ سمجھ لو اس لئے شریعت نے کہا دوا کرو اور پھر دعا بھی کرو دوا اپنے فرض کو ادا کرنے کے لئے اور دعا اس کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لئے۔

تقدیر کا عقیدہ حق ہے مگر یہ تصور کہ اس بنیاد پر بے عملی کی زندگی حق بجانب قرار پائی ہے، بالکل غلط ہے۔

ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ اللہ رزق کا ضامن ہے۔جب اللہ ضامن ہے تو پھر ہم مشقت کیوں اٹھائیں؟ یہ سوال امام کے سامنے پیش ہوا جب آپ نے کسی سے فرمایا آخر تم کچھ کرتے کیوں نہیں؟ اس نے جواب دیا اللہ رزق کا ضامن ہے تو ہم کیوں مشقت کریں؟ حضرت نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی تم کو ہاتھ اور پاؤں دے کر اب اس کی ذمہ داری تم پر ہے کہ تم

اپنے رزق کو ان کے ذریعہ حاصل کرو۔

بے شک حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی طرف دو شعر منسوب ہوئے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا جو بچہ کو شکم مادر میں غذا پہنچاتا ہے ہمیں غذا نہ پہنچائے گا؟

یہ اگر مولا کا کلام ہوتا تو ضرور غور طلب تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرت کا کلام نہیں ہے اور حقیقت کے لحاظ سے درست بھی نہیں ہے اس لئے کہ بچہ کو اللہ رزق اس وقت تک دیتا ہے، جب تک اپنی طرف سے قید خانہ میں رکھتا ہے اور جب وہ اس دار دنیا کی کھلی فضا میں آگیا تو اب ماں باپ کا فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو پورا کریں اور اب استدلال کا رُخ پلٹ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو بچہ کو بغیر انسانی عمل کے رزق نہ پہنچائے وہ ہم ایسے ہاتھ پیر والوں کو بغیرِ سعی و عمل رزق کیوں دے گا؟

جانور تک رزق حاصل کرنے کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ جب جانور بغیر سعی و عمل کے نہیں کھاتا تو انسان بغیر سعی و عمل کے کیونکر کھا سکتا ہے؟

بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ جب ہمارے باپ دادا نے تجارت نہیں کی تو ہم یہ ٹکے ٹکے کی چیزیں کیونکر فروخت کریں۔ یہ ہماری بے عزتی ہے کہ ہم پھیری کریں یا دوکان لگائیں۔ جو یہ کہتے ہیں، وہ سنیں کہ آپ کے باپ دادا نے تو کبھی فاقے نہیں کیئے تھے۔ یہ حضور والا کیوں فاقہ کرتے ہیں؟

باپ دادا نے ایسا نہیں کیا تھا، اس لئے کہ ان کے پاس مفت کی دولت تھی، انھیں ضرورت نہ تھی اب آپ کو ضرورت ہے تو آپ کو یہ سب کرنا چاہئے۔

اب دوسروں کی ذہنیت اور ان کے طرز عمل کی غلطی یہ ہے کہ کل تک وہ مرزا صاحب، میر صاحب، خان صاحب وغیرہ کہلاتے تھے اور جب سے وہ ترکاری بیچنے لگے، بسکٹ فروخت کرنے

لگے تو اب ترکاری والے اور بسکٹ والے کہلانے لگے، میر صاحبی اور خان صاحبی ختم ہوگئی۔ آخر ان کے طرز عمل میں یہ تبدیلی کیوں پیدا ہوئی؟ ان کا یہ عمل ان کی غلط ذہنیت کا ترجمان ہے۔ لیکن انھیں اس کا برا نہ ماننا چاہئے۔ میں تو کہتا ہوں کہ جب تک وہ میر صاحب اور مرزا صاحب کہلاتے تھے، وہ ایک وصف اضافی کا اظہار تھا۔ اور اب جو ان کے کاروبار کے لحاظ سے ان کو پکارا جا رہا ہے تو یہ جوہر ذاتی کا اعلان ہے۔ جس پر انھیں فخر کرنا چاہئے۔

ہمارے رہنمایان دین نے اپنے عمل سے ہمارے تصورات کی اصلاح کے لئے سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔ ہم زیادہ تقدیر کے قائل یا رسولؐ خدا اور امیر المومنینؑ؟ ہم خدا کے ضامن رزق ہونے پر زیادہ با ایمان یا یہ لوگ؟ ہم زیادہ حقیقی معیار توکل کے جاننے والے یا یہ حضرات؟

پیغمبرؐ خدا نے رسالت سے پہلے اپنا تعارف دنیا سے بحیثیت تاجر کے کرایا...... تجارت کی اس سے بڑی بلندی کیا ہوگی کہ بر بنائے واقعہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک تاجر کو اللہ نے خاتم المرسلینؐ بنایا۔ اب اگر کوئی آدمی تاجر کو حقیر سمجھے تو بات کہاں جاتی ہے؟

اگر تجارت بری چیز ہوتی تو خالق بلند حقیقتوں کی تعبیر تجارت سے نہ کرتا مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ.

”اے ایمان والو! کیا میں تمہیں بتاؤں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے۔“

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ.

”وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کرو۔“

محسوس ہوتا ہے کہ مخاطب وہ جماعت ہے جو تجارت پیشہ ہے یہاں تک کہ شہداء راہِ خدا کو میدان جنگ میں جو رفعت دی جارہی ہے وہ یوں کہ

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ.

''اللہ نے مول لیا مومنین سے ان کے جان و مال کو اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔''

یاد رکھنا چاہئے کہ قیمت وہ ہوتی ہے جس کی نظر خریدار میں مالیت ہو۔ یہ عام مومنین تھے جن کا منتہائے نظر جنت ہے۔ ان کے نفوس کی قیمت جنت ہوگئی۔ لیکن اگر کوئی ایسا بلند نظر بندہ ہو کہ وہ بارگاہ الٰہی میں کہتا رہا ہو:

مَا عَبَدْتُکَ طَمَعًا فِیْ جَنَّتِکَ وَلَا خَوْفًا مِنَ النَّارِکَ وَلٰکِنْ وَجَدْتُکَ اَھْلًا لِلْعِبَادَۃِ فَعَبَدْتُکَ.

''میں نے تیری عبادت تیری جنت کی لالچ میں نہیں کی، نہ تیری اس آگ کے ڈر سے کی ہے مگر میں نے تجھ کو عبادت کا حقدار پایا اس لئے تیری عبادت کی۔

کیا عبودیت کی نیازمندی میں اتنی بے نیازی کی شان کبھی تصور میں آسکتی تھی۔ بہر حال اس سے پتہ چل گیا کہ اس بندہ کی نظر میں جنت کوئی قیمت نہیں رکھتی تو اب اس کے نفس کی قیمت جنت کہاں ہوسکتی ہے؟ اس لئے قرآن جب اس کی قیمت بتائے گا تو جنت نہیں بلکہ رضائے الٰہی جس کا جنت ایک ثمرہ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ.

تو یہ اتنی بڑی قربانی بھی کہ خیبر و خندق کا جہاد بھی جو متحرک انداز کا تھا اتنا عظیم شاید نہ تھا۔ جتنی کہ یہ ساکت و ساکن قربانی تھی کہ بستر رسولؐ پر فدیۂ رسولؐ بنے رات بھر سوتے رہے یعنی

علیؑ اگر کھلے ہوئے علیؑ ہوتے تو اتنے خطرہ میں نہ تھے جتنے رسولؐ بن کے لیٹنے سے خطرہ میں تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بھیس بدلا جاتا ہے مگر عموماً بھیس وہ اختیار کیا جاتا ہے جو خطرہ سے دور ہو مرد عورتوں کا لباس پہن کر خطرہ سے نکلا کرتے ہیں مگر یہ نیا بھیس بدلنا تھا کہ جس کی جان لینے کا منصوبہ ہو اس کا بھیس اختیار کیا جائے تو علیؑ نے یہ اتنی بڑی قربانی بحیثیت تاجر کی اور بیعنامہ خالق نے قرآن میں اتار دیا مگر یہ نجات نقاب پوش تجارت تھی جس میں خریدار خدا تھا۔

اب وہ وقت ہے جب علیؑ گوشہ نشین نہیں بلکہ خلافت ظاہری کی مسند پر ہیں۔ میثم تمار کی دوکان ہے اور علیؑ بیٹھے خرمے تول تول کر گاہکوں کو دے رہے ہیں۔

اب بتایئے کیا تجارت بری چیز ہے؟ کیا محنت و مشقت کرنے سے شرافت خاندانی جاتی رہتی ہے؟

ہمارے چھٹے امام جعفر صادقؑ ایک باغ کی دیوار کو اپنے ہاتھ سے اونچا کررہے ہیں۔ اصحاب کہتے ہیں: ''مولا! ہم دیوار بنا دیں'' فرماتے ہیں نہیں میں اپنے قوت بازو سے اپنا رزق حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

دوپہر میں بازار کی طرف جارہے ہیں۔ جسم تمام پسینے سے شرابور ہے، ایک دعویدار زہد وتقویٰ نے پوچھا کہاں جارہے ہیں۔ فرمایا بازار جارہا ہوں انھوں نے کہا آپ فرزند رسولؐ ہو کر طلب دنیا کے لئے جارہے ہیں! کیا آپ کو اس کا اندیشہ نہیں کہ اسی حالت میں موت آجائے جب کہ کار دنیا میں مصروف ہیں۔ حضرت نے جواب دیا: بخدا اگر مجھے اس حال میں موت آجائے تو میں اللہ کو گواہ کروں گا کہ میں تیرے احکام کی تعمیل کی حالت میں دنیا سے گیا ہوں۔

ایک بار ایک جوان بیلچہ کاندھے پر رکھے ہوئے مسجد نبوی کے سامنے جارہا تھا۔ حاضر الوقت صحابہ میں سے کسی نے کہا، کاش اس کی جوانی راہِ خدا میں صرف ہوتی۔ رسولؐ نے کہا، تم نے کیونکر

جانا کہ اس کی زندگی راہ خدا میں صرف نہیں ہو رہی ہے؟ یاد رکھو اگر وہ پیٹ پالنے کے لئے جا رہا ہے تو یہ اس کا عمل راہ خدا میں ہے اور اگر اہل وعیال کے لئے آزوقہ فراہم کرنے جا رہا ہے تو یہ اس کا عمل اللہ کی راہ میں ہے ہاں اگر اس خیال سے جا رہا ہے کہ پیسہ حاصل کر کے اپنے اور بھائیوں پر فوقیت جتاوے تو یہ عمل شیطان کے لئے ہے۔ اب یہ جس چیز کو عمل شیطان کہا گیا ہے، اس میں دنیوی سعی وکوشش کی خصوصیت نہیں ہے نماز پڑھنے میں اگر دوسروں پر فوقیت جتانا پیش نظر ہو تو وہ نماز بھی فی سبیل اللہ نہیں ہے۔

بعض مذاہب میں مشقت اٹھانا اور اپنے کو اذیت پہنچانا خود عبادت ہے۔ مثلاً ہاتھ کا اٹھائے رکھنا اور اس طرح اسے خشک کر دینا۔ کئی کئی دن کھڑے رہنا جس سے پیروں پر ورم آ جائے یا اور طرح طرح سے جسمانی اعضا کو اذیت دینا۔ تختہ پر جس میں میخیں گڑی ہوئی ہوں، برہنہ جسم کو معلق رکھنا، مگر اسلام دین عمل ہے۔ دین اذیت نہیں ہے۔ ہاتھ خشک کر لیا تو یہ ہاتھ کس نے دیا تھا؟ اللہ نے۔ اور کسی مقصد کے لئے دیا تھا تو جب ہاتھ خشک کر لیا تو ان مقاصد کو نقصان پہنچایا جن کے لئے ہاتھ عطا ہوا تھا ہاں بے شک اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَحْمَزُھَا. ''اعمال سب سے زیادہ افضل وہ ہے جس میں زیادہ مشقت ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں مشقت بامقصد ہونا چاہئے۔ عبادت کے لحاظ سے فضیلت اس کام کی ہے جس کے لئے مشقت اٹھائی جا رہی ہے۔ خود مشقت یا اذیت اٹھانا کوئی کام نہیں اور نہ وہ خود کوئی بلند مقصد ہے مگر دوسروں کے یہاں خود مشقت یا اذیت اٹھانا عبادت ہے۔ اسی طرح جان دینا ہمارے یہاں کوئی چیز نہیں ہے۔

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جان دینا عبادت ہے اسے کہا گیا ہے۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتاً. جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو۔ ہم اس کی تعبیر کرتے ہیں حیات شہداء سے مگر قرآن میں حیات شہداء کے ذکر میں لفظ شہدا نہیں ہے بلکہ معیار شہداء بتایا ہے۔ جو قتل ہوا اللہ کی راہ کون جانے؟ منزل مادی ہو تو راستہ مادی ہوگا۔ یہ ہے اللہ کا راستہ، اب

جادہ شناس وہی ہوگا جو منزل شناس ہو لہٰذا جو اللہ کی معرفت کامل رکھتا ہو وہی اس کی راہ کا سمجھنے والا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے بغیر اذن معصوم جو ہو وہ جنگ ہوگی مگر جہاد نہ ہوگا۔

اگر خاندانی حمیت پر جان دی تو وہ اللہ کے لئے نہیں ہے۔ اس کا معاوضہ خاندان سے لینا چاہئے۔ اگر حمیت قومی کے لئے جان دی تو یہ اللہ کی راہ میں نہیں ہے۔ قوم سے اس کا صلہ ملنا چاہئے۔ صرف جوش میں کوئی کارنامہ ہوا تو وہ اللہ کی راہ میں نہیں ہے۔

پیغمبر خدا کے زمانہ میں اسامہ نے ایک کافر پر وار کیا اس نے تلوار کی زد پر آ کر کلمہ پڑھ دیا مگر ان کا ہاتھ نہ رکا اور اسے قتل کر دیا۔ حضرتؐ نے جب سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ دل سے اس نے کلمہ نہیں پڑھا تھا بلکہ جان کے خوف سے پڑھا تھا۔ آپ نے فرمایا: ھَلَّا شَقَقْتَ قَلْبَهٗ کیا تم نے اس کا دل شگافتہ کر کے دیکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ ہر قدم پر ہوش رکھنے کی ضرورت ہے، جوش سے کام نہیں چلتا۔

غرض بات تو کاروبار اور طلب معاش کی تھی۔ اب میں کتب رجال کا حوالہ دوں گا۔ اصحاب ائمہ یہ دور معصومینؑ کے ہمارے علماء تھے۔ ان میں سے کسی کے نام کے ساتھ طحان پیسنے والا، کسی کے نام کے ساتھ تمار ''خرمے بیچنے والا'' کسی کے نام کے ساتھ جمال ''اونٹوں کی ساربانی کرنے والا'' کسی کے نام کے ساتھ تبان یعنی ''گھانس وغیرہ فروخت کرنے والا'' کوئی دھان یعنی ''گھی، تیل بیچنے والا'' اس سے ظاہر ہے کہ محنت ومشقت عزت کے خلاف نہیں ہے۔

فرائض حج میں بھی سعی کی اہمیت ظاہر ہے جس کا پس منظر یہ کہ خلیل حق نے دودھ پیتے بچہ کو اس کی ماں کے ساتھ بے آب وگیاہ میدان میں پہنچا دیا۔ چلتے وقت ایک کوزہ آب اور دو چار روٹیاں دے گئے، وہ کب تک چلیں۔ ظاہر ہے کہ پہلے ماں پر بھوک اور پیاس کا غلبہ ہوا مگر ماں نے اس کو برداشت کیا۔ اس کے بعد ایک وقت وہ آیا کہ بچہ کی فطری غذا کا خزانہ ختم ہو گیا۔ اب بچہ پر بھوک پیاس کا غلبہ

ہوا۔ جب ماں نے بچہ کو تڑپتا دیکھا تو کھڑی ہو گئیں اور صفا و مروہ دو پہاڑیوں پر گئیں تلاش آب کے لئے۔ اب خیال ہوا کہ بچہ اکیلا ہے تو دوڑ کر بچہ کے پاس آئیں اور پھر بچہ کا تڑپنا دیکھا نہ گیا تو دوبارہ تلاش آب کے لئے پہاڑی پر گئیں۔ سات دفعہ آئیں اور گئیں۔ عقل سے پوچھیے وہ قادر مطلق جو بعد میں زمزم کو نمودار کر سکتا تھا کیا وہ اس پر قادر نہ تھا کہ پہلے ہی جب غلبۂ عطش ہوا تو زمزم نمودار کر دیتا۔ لیکن اسے تو یہ سنت قائم رکھنا تھی کہ پہلے سعی کرو۔ پھر نتیجہ کا انتظار کرو۔ سعی کرو تو رحمت الٰہی تمہارے شامل حال ہو گی۔

اب قیامت تک کے لئے مسلمانوں کو بھی دونوں پہاڑیوں کے درمیان گردش کرنا ہے اور اس کا نام وہی ''سعی'' ہے۔

یہ سعی کیا ہے؟ ایک بی بی کے عمل کی شبیہ ہے ورنہ ہم جو سعی کرتے ہیں تو کیا ہم تلاش آب کرتے ہیں؟ نہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل مقصد عمل کا تعلق صاحب عمل سے ہوتا ہے اور بعد میں ہمارا کام اس کی یاد کا قائم رکھنا ہوتا ہے۔ صفا و مروہ وہ دونوں پہاڑیاں جہاں یہ سعی ہوئی تھی شعائر اللہ کا جزو بن گئیں۔ حالانکہ جناب ہاجرہ کا صرف قدم مس ہوا تھا۔ ان کے پاؤں سے خون کا قطرہ نہیں ٹپکا تھا۔ پھر بھی یہ دونوں پہاڑ شعائر اللہ بن گئے تو جس زمین میں شہیدوں کا خون جذب ہو گیا ہو، وہ زمین کیا شعائر اللہ میں داخل نہیں ہو گی؟

مناسک حج میں زیادہ تر ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی یادگاریں ہی ہیں ارشاد ہوا ہے:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِمَ مُصَلًّى.

ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو اپنی نماز کا مقام بناؤ۔

اسی بناء پر نماز طواف مقام ابراہیم میں پڑھی جاتی ہے۔ اب بتایئے کہ کیا ابراہیمؑ کا تصور اس نماز میں نہیں رہے گا؟

جو مقاصد الٰہی میں اپنی زندگی صرف کرتے ہیں، ان کی یاد مرضیٔ الٰہی سے ہوتی ہے۔

منیٰ کی قربانی میں حاجی کتنا روپیہ صرف کرتا ہے؟ اور مسلمانوں کا اتنا پیسہ بلاوجہ صرف ہوتا

ہے، مگر نہیں یہ بلاوجہ نہیں ہے۔ خاصان الٰہی کی یاد قائم کرنا خود اتنا گرانقدر مقصد ہے جس کے مقابلے میں معاشی پہلو کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ قربانی کیا ہے؟ آخر اس میں دس ذی الحجہ کی کیا خصوصیت ہے چونکہ آج سے مدتوں پہلے یہ قربانی ہوئی تھی۔ لہٰذا اس دن اس قربانی کو یاد کرو۔

پھر اگر لفظی یاد کافی ہوتی ہے تو قربانی ابراہیمؑ کی متعلقہ آیتیں پڑھ لیتے مگر خالق فطرت واقف ہے کہ فطرت انسانی میں لفظی یاد اتنی اثر انداز نہیں ہوتی جتنی کوئی مجسم شکل میں عملی صورت، یہ قربانی شبیہ عمل خلیل ہے۔ وہ سعی شبیہ مادر اسماعیل تھی پھر ان جانوروں کو دیکھیے۔ یہ کس کے شبیہ ہیں؟ یہ شبیہ اسماعیل تو نہیں ہیں کیونکہ اسماعیل کا ذبح عملی طور پر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا۔ وہ ذبح ہوئے نہیں بلکہ یہ شبیہ اس گوسفند کی ہے جو فدیہ بن کر آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جانور جو کسی ولی خدا کے کام آئے، اس کی بھی یادگار منانا خالق کو پسند ہے۔ اس کے بعد ذوالجناح کی شبیہ پر کسی کو معترض نہ ہونا چاہیے۔

فریضۂ اسلامی انسانی کسی قربانی کا بھلانا نہیں ہے۔ ۱۰ ذی الحجہ کو فرزند خلیل کی قربانی ہے اور ۱۰ محرم کو فرزند حبیب حق کی قربانی۔

جناب ابراہیمؑ سے ہمارا اعتقادی رشتہ ہے۔ عملی رشتہ نہیں اور اپنے رسولؐ سے عملی رشتہ بھی ہے کہ ان کے تعلیمات پر ہمیں کاربند ہونا ہے تو فرزند خلیل کی قربانی کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے اور خود اپنے رسول کی قربانی یاد رکھنے کے قابل نہ ہو گی؟

اب کوئی کہے کہ وہ یاد تو بطور عید ہے۔ یہاں غم کیوں کیا جاتا ہے میں کہتا ہوں کہ یہ نتیجہ کے فرق کی بنا پر ہے۔ روز قربانی اسماعیل روز عید ہے اس لئے کہ دنبہ آ گیا اور نبی زادہ بچ گیا مگر دس محرم کو فرزند رسولؐ ذبح ہو گیا، اس لئے روز غم ہے۔

اور یہ تصور کہ جو مرتبۂ شہادت پر فائز ہو، اسے رونا نہیں چاہیے غلط ہو گیا۔ جناب حمزہ کی مثال سے کہ جب آپ شہید ہوئے تو رسولؐ کی خواہش کے مطابق انصار کی عورتیں خانۂ جناب حمزہ میں آ کر صفیہ کو پرسا دے کر گریہ کرنے لگیں اور آواز گریہ رسول تک پہنچی تو آپ نے دعا کے

لئے ہاتھ اٹھائے، اے بی بیو اللہ تم سے راضی ہو تمہارے شوہروں سے راضی ہو تمہاری اولاد سے راضی ہو۔ اب انصاف سے دیکھئے پیغمبرؐ خدا نے خواتین اغیار کے گریہ کی آوازوں پر حسرت سے فرمایا تھا:

اَمَّا عَمِّی حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ۔

میرے چچا حمزہ پر رونے والیاں نہیں ہیں تو اگر رسول کربلا میں ہوتے تو یہ نہ فرماتے کہ

اَمَّا وَلَدِیْ حُسَیْنٌ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ۔

میرے فرزند حسینؑ پر رونے والا کوئی نہیں ہے اور پھر زیادہ حسرت ناک بات یہ ہے کہ رونے والے ہوں مگر رونے نہ دیا جائے۔

امام حسینؑ کو رونے والے موجود تھے۔

زینبؑ، ام کلثوم ایسی بہنیں، فاطمہ سکینہ ایسی بیٹیاں لیلیٰ و ربابؑ ایسی بیویاں اور سید الساجدین ایسے فرزند مگر............ مگر یہ لوگ رونے کہاں پائے؟ جو رونے کا خاص وقت تھا، اس وقت خیموں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ بی بیوں کا عالم یہ تھا کہ ایک خیمہ میں آگ لگتی تھی تو دوسرے خیمے میں چلی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ آگ کے شعلوں میں سب خیام گھر گئے مگر اب بھی گھبرا کے قدم باہر نہیں نکلتے۔ سمٹ سمٹ کر ثانی زہراؑ حضرت زینبؑ کے پاس آئیں کہ آپ جانشین فاطمہؑ ہیں، بتائیے ہر طرف آگ کے شعلے بلند ہیں کیا کریں؟

حضرت زینبؑ، یقیناً مسئلہ شرعی سے واقف تھیں مگر فریضہ حجاب کی اہمیت دکھانا تھی کہ فرماتی ہیں بی بیو! مجھ سے کیوں پوچھتی ہو؟ خدا امام وقت کو زندہ رکھے بغیر اس سے پوچھے میں کیا جواب دوں؟ آئیں۔ اب سید سجادؑ کے پاس...... دیکھئے یہ امتحان کیسا سخت ہے؟ ہمارے چوتھے امام سے باپ کے بعد بحیثیت امام مسئلہ کیا پوچھا جاتا ہے؟ وہ یہ ہے کہ پھوپھی سرہانے کھڑی ہیں، کہتی ہیں، بیٹا دیکھو چاروں طرف خیموں میں آگ کے شعلے بلند ہیں۔ اب تم امام وقت ہو، بتاؤ حکم خدا اس وقت کیا ہے۔ جل کر مر جائیں یا خیموں سے باہر نکلیں اور اب سید سجادؑ کو کہنا پڑتا ہے کہ اب خیموں سے باہر نکلئے اور وہ بی بیاں جن کی ماں کا جنازہ رات کو اٹھا تھا، خیموں سے روز روشن میں باہر

آتی ہیں اس طرح کہ لَا طِمَاتُ الْوُجُوْہِ نَاشِرَاتُ الشُّعُوْرِ۔ ''اپنے منہ پر طمانچے مارتی ہوئیں بال سروں کے بکھرائے ہوئے۔''

(۲)

(۱۲/نومبر ۱۹۷۷ء ۱۱/بجے دن، فیض آباد)

یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّیُرَوْا اَعْمَالَھُمْ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔

دوسرا شعبۂ آخرت کی کامیابی کے لئے عمل۔ اب دنیا کے مقاصد کے لئے کوئی زاہد کہہ سکتا تھا کہ ہمیں مال کی ضرورت نہیں۔ کامیابی دنیا کی ضرورت نہیں مگر کیا کوئی مومن ایسا ہے جو کہے مجھے جنت کی ضرورت نہیں یا نجات آخرت کی ضرورت نہیں۔ یہ تو وہی کہے گا جو آخرت کا قائل نہ ہو تو جنت اور کم از کم نجات ہر فرد مسلم کا نصب العین ہے۔ مگر تصور یہی ہے کہ ہمیں کچھ کرنا نہ پڑے۔ نتیجہ بہتر سے بہتر حاصل ہو اور سعی کا سوال پیدا نہ ہو۔ مگر میں پورے مطالعہ قرآن کے سہارے سے عرض کر رہا ہوں کہ قرآن میں آخرت کی نوید ہر جگہ عمل پر دی گئی ہے اور جن جن مختلف الفاظ سے اس مقصد کو نمایاں کیا گیا ہے، ان پر اگر کتاب لکھی جائے تو ہر قسم کے آیات کو علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ آیت جو میرا سر نامۂ کلام ہے کہ ''آخرت میں تمام لوگ نکلیں گے۔ گروہ در گروہ تا کہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں تو جو ذرّہ برابر بھی عمل خیر کرے گا، وہ اسے دیکھ لے گا وہ جو ذرہ بھی عمل شر کرے گا اسے دیکھ لے گا۔'' یہ ایک باب کی نمائندہ ہے جو عمل کے عنوان سے ہے دوسری صنف ان آیات کی ہے جو سعی کے عنوان سے ہیں: مثلاً

مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَشْکُوْرًا۔

جو آخرت کو پیش نظر رکھے۔ اور اس کی خاطر وہ سعی بھی کرے جو اس کے لئے درکار ہے در

حالانکہ وہ مومن ہو تو اس کی سعی کی ناقدری نہیں ہوگی۔

بعض آیات میں محسن کی لفظ آئی ہے۔ قرآن حسن عمل کو احسان کہتا ہے یہ یہود و نصاریٰ کا تصور تھا کہ جماعتی طور پر ہم نجات اور داخلۂ جنت کے حقدار ہیں۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَا كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارىٰ، تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ.

"ان کا قول ہے کہ بہشت میں ہرگز کوئی داخل نہیں ہوگا، سوا اس کے جو یہودی ہو (یہ یہودی کہتے ہیں) یا عیسائی ہو (یہ نصاریٰ کا قول ہے)۔

ہماری عام ذہنیت کے مطابق اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ واہ مسلمانوں کے سوا کوئی بہشت میں نہیں جاسکتا۔

مگر یہ جواب ہی کیا تھا، یہ جو دعووں کا ٹکرانا ہوتا جیسے وہ ان کا ایک نعرہ تھا ویسے ان کے بالمقابل مسلمانوں کا ایک نعرہ ہو جاتا۔

قرآن کہتا ہے ان کے جواب میں یہ کہو کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔ اب اس سے یہ اصول قائم ہو گیا کہ بغیر دلیل کے کسی کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

بَلىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ.

انھوں نے کہا تھا سوا یہود و نصاریٰ کے کوئی جنت میں نہیں جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے کیوں نہیں! مگر اب یہ نہیں کہا جاتا کہ مسلمان یقیناً جنت میں جائیں گے۔ اگر یہ مسلمان کہا جاتا تو وہ ایک جماعت کا لقب قرار پا جاتا لہٰذا مسلمان نہیں کہا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے کہ جو اپنے چہرہ کو بالکل اللہ کی طرف موڑ دے یعنی جو مسلم بتایا جا رہا ہے۔

"اور اس کے ساتھ حسنِ عمل رکھتا ہو" تو اس کے لئے اس کا اجر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا کہ ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ یا یہ کہ اجر ہے جس سے سمجھا جاتا کہ ہر مسلم کے لئے نیک عمل ہو۔ ایک معین اجر ہے جو یکساں طور پر ملے گا۔ بلکہ لَهُمْ أَجْرُهُمْ ان کے لئے ان کا اجر ہے۔ کیا مطلب؟ یعنی جتنا حسنِ

عمل عمل ہو اتنے اجر کا حق ہے۔ اور انجام میں نہ ان کے لئے خوف ہے، نہ ان کے لئے۔ ایک جگہ ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا. خدا نہیں برباد کرتا اجر کو اس کے جو اپنے اعمال کو درست رکھے۔

ایسی ہی کتنی آیتیں قرآن کی ہیں جن میں عمل کی اہمیت، دکھائی گئی ہے۔

سب کا خلاصہ یہ ہے کہ "اسلام دین عمل ہے۔ اب کتنی عبرت کی بات ہے کہ جس قوم کی بنیادی کتاب میں اتنا عمل پر زور دیا گیا ہو، اس قوم میں یہ تصور پیدا ہو جائے کہ اعمال کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر مسلمانوں کے اندر کوئی خاص جماعت ایسی ہو کہ وہ نجات کو اپنا خصوصی حق سمجھ لے کہ صرف ہم نجات کے حقدار ہیں تو دیکھنا ہوگا کہ مسلمانوں میں اس جماعت کا امتیاز خاص کیا ہے؟

توحید مشترک، نبوت مشترک، قیامت مشترک، فرقۂ ناجیہ کا امتیاز صرف عدل و امامت سے ہے۔ اور اسی لئے ہم اپنے کو امامیہ کہتے ہیں۔ اب اس جماعت کے کچھ افراد کو تصور ہو کہ ہمیں عمل کی ضرورت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ امامت کے تصور کا تو لازمی نتیجہ ہے پیروی، اور یہ نبوت و رسالت و امامت ان سب کے لغوی معانی سے ظاہر ہے۔ نبوت اور رسالت جس کا حامل نبی و رسول ہوتا ہے، ان لفظوں کا براہ راست تقاضہ وجوب اطاعت نہیں ہے۔ ان دونوں منصبوں کے علاوہ امامت ہے جس کا حامل امام ہوتا ہے۔ یہ ہمارا اخبری امین ہے۔ اب تینوں کے لغوی معنی ملاحظہ ہوں۔

نبی کے معنی ہیں خبر دینے والا تو دوسروں کا کام کیا ہے۔ تصدیق کرنا۔ رسالت کے معنی پیغام پہنچانا تو دوسروں کا کام ہے پیغام کو قبول کرنا۔ لیکن امام کے معنی ہیں۔ آگے آگے چلنے والا تو دوسروں کا کام کیا ہے؟ پیچھے پیچھے چلنا۔ اب اس سے ایک اور پہلو پر توجہ فرمائیے۔ نبی کے معنی خبر دینے والا تو نبی کی ضرورت اس وقت تک کہ جب تک کوئی ایک خبر بھی پہنچانا باقی ہے۔ رسول کا کام پیغام پہنچانا تو جب تک کوئی پیغام پہنچانا باقی ہے اس وقت تک یہ کام ہے اور جب یہ آخری پیغام پہنچا دیا اور تکمیل دین ہو گئی تو اب رسول کی ضرورت نہیں لیکن امام کے معنی ہیں آگے آگے چلنے والا تو جب تک جادہ باقی ہے اور چلنے والے موجود ہیں، تب تک رہنمائی باقی رہنا ضروری ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے نماز میں امام جماعت ہوتا ہے تو اس کی پیروی اتنی ضروری ہے کہ رکوع رکن نماز ہے۔ پسندہ خدا ہے مگر امام سے پہلے ہو گیا تو باطل۔ سجدہ محبوب ترین عمل ہے مگر امام سے پہلے ہو گیا تو باطل۔ اب انصاف کیجئے کہ امام جماعت کی متابعت ضروری ہو اور جو دین و دنیا کا کلیۃً امام ہو اس کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے اور افعال کی متابعت نہ ہو۔ کیا صرف بارہ امام کے نام سنا دینا ہی کافی ہے اور ان کی رہنمائی اور مثالی سیرت سے کوئی بحث نہیں۔ مگر یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں بلا تفریق فرقہ یہ بات ہوگئی ہے کہ عمل سے جان بچاتے ہیں۔ پہلے تمام مسلمانوں نے اپنے کو امت مرحومہ کہہ دیا مگر اس کی کوئی دلیل ہونا چاہئے۔ آخر کیا خصوصیت ہے کہ جو پوری کی پوری امت مرحوم ہو جائے۔ اس کی دلیل یہ کہی جاسکتی ہے کہ چونکہ ہم رحمۃ للعالمین سے وابستہ ہیں اس لئے رحمت الٰہی ہمارے شامل حال ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمارا راستہ رحمۃ للعالمین کے راستے سے الگ ہو گیا تو بتایئے رحمت الٰہی ادھر آئے گی یا اُدھر جائے گی؟

پھر امت ہونا تو ایک رشتہ ہے ہم رسولؐ سے رشتہ بتا رہے ہیں مگر رسول بھی تو ہمیں اپنی امت میں سمجھیں۔ قرآن مجید میں ایک رسول کی زبانی اعلان ہے:

مَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ.

''جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے۔''

اس کے معنی یہ ہیں کہ جو پیروی نہیں کرتا وہ رسول سے تعلق نہیں رکھتا تو امت رسولؐ ہونا کیسا؟ پھر اس کے بعد رسولؐ اپنی امت فرما بھی دیں، اللہ بھی تو رسولؐ کی امت میں جانے۔ کوئی کہے یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ رسولؐ اپنی امت کہیں اور اللہ قبول نہ کرے؟ میں کہتا ہوں کہ حضرت نوحؑ بھی تو رسول تھے، وہ کہہ رہے تھے ''اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ'' میرا بیٹا میرے اہل سے ہے۔ خالق نے پہلی نسبت کی نفی نہیں فرمائی۔ جواب میں یہ نہیں کہا کہ وہ تمہارا بیٹا نہیں ہے مگر دوسری نسبت کے لئے کہا جاتا ہے۔ ''اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ'' وہ تمہارے اہل سے نہیں ہے۔ ''اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ'' اس کے اعمال اچھے نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ اعمال وہ ہیں کہ بیٹا اہل سے خارج ہو جاتا ہے۔ امت ہونا کیا چیز ہے۔ اب جس پیغمبر خاتم کی زبان سے نوحؑ کا واقعہ ہم تک پہنچا ہے، وہ اگر چادر کھینچ کر کبھی کچھ افراد کے لئے کہہ

دے۔

اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلِیْ. ''پروردگار! یہ میرے اہل ہیں'' تو اب دنیا نسبی رشتے نہ دیکھے کہ یہ داماد ہیں، وہ بیٹی ہیں، وہ نواسے ہیں بلکہ محسوس کرے کہ ان کا کردار اتنی بلندی پر ہے کہ پیغمبرؐ اپنے پیغمبرانہ ضمیر کے استحکام کے ساتھ خود اللہ سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ یہ میرے اہل ہیں۔

بہر حال یہ تو تمام مسلمانوں کی بات تھی کہ انھوں نے من حیثیت الجماعت اپنے کو امت مرحومہ قرار دیا۔ اب امت کے ایک گروہ کا ذکر ہے جس نے اپنا لقب قرار دیا ''فرقۂ ناجیہ''، ''ناجیہ'' سے مطلب نجات پانے والے۔ وہ قرآنی مطالبہ کہ اپنی دلیل پیش کرو، ان کی طرف بھی متوجہ ہے مگر بحمد اللہ فرقہ ناجیہ کی ایک فرد ہوتے ہوئے میں اس کی دلیل پیش کرسکتا ہوں۔

یہ حدیث متفق علیہ ہے کہ رسولؐ نے فرمایا:

سَتَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلَاثَةٍ وَّسَبْعِیْنَ فِرْقَةً كُلُّهُمْ فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةً. ''میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے جن میں سب آتش دوزخ میں ہوں گے۔ سوا ایک فرقہ کے۔

اس سے سمجھ میں آیا کہ تجارت کے لئے امت میں ہونا کافی نہیں ہے۔ اس فرقہ میں ہونا ضروری ہے۔ اب پیغمبرؐ ہی نے پہچان بھی ناجی فرقہ کی بتائی ہے۔ ورنہ پیغمبرؐ خدا پر حرف آتا کہ نجات کے حقدار کی نشان دہی نہ کی۔ تہتر راستوں میں ہم کیوں کر صحیح راستے کی شناخت کریں جو منزل تک پہنچائے۔ اگر پیغمبرؐ نہ بتاتے تو مسلمانوں کا فریضہ تھا کہ رسول کا دامن تھام کر پوچھیں کہ اس فرقہ کی پہچان تو بتا دیجئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ نے بتایا، اگر بتایا نہ ہوتا تو اصحاب پوچھتے کیوں نہ؟ بے شک بتایا اور ان الفاظ میں بتایا کہ:

مَثَلُ اَهْلِ بَیْتِیْ كَمَثَلِ سَفِیْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ وَهَوٰی.

''میرے اہلبیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا، اس نے نجات پائی اور جس نے تخلف کیا وہ ڈوبا اور گیا۔'' تخلف کے معنی کیا ہیں؟ کشتی پر نہیں بیٹھا یا بیٹھ کر راستے میں کسی منزل پر اتر گیا وہ فرقہ جو کشتی اہلبیتؑ میں سوار ہوا ہے، وہ ناجی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کشتی اہلبیت پر بیٹھنے کا مطلب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ استعارہ ہے۔ استعارہ کی

بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے۔ کوئی ایک بات مشتبہ اور مشبہ میں مشترک ہوتی ہے، وہ وجہ جامعہ کہلاتی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کشتی پر بیٹھنے میں کیا ہوتا ہے؟

اس سوال کا مفہوم ان سوالات اور ان کے جوابات سے واضح ہوگا آپ ساحل پر کھڑے ہیں اور کشتی دریا میں ہے۔ ساحل پر سے آپ کشتی کی تعریف کریں کہ بہت خوبصورت کشتی ہے، تو یہ کیا کشتی پر بیٹھنا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ نہیں، یہ کشتی پر بیٹھا نہیں ہے۔

اب دوسری بات، ساحل پر کھڑے ہی کھڑے کہنے لگیں کہ ہم اس کشتی کو بہت چاہتے ہیں اور دعوائے محبت صحیح بھی ہو، کیوں کہ اگر وہ کشتی قابل محبت ہے تو اس سے محبت ہونا چاہئے۔ یہ کوئی آپ کا کارنامہ نہیں ہے یہ اس کے حسن کا تقاضا ہے مگر محبت ساحل پر کھڑے کھڑے کشتی پر بیٹھنا تو نہیں ہے۔ اب اس کے بعد نازک تر منزل ہے کہ ساحل پر کھڑے ہیں اور کشتی بھنور میں پڑ گئی۔ بادِ مخالف کے تھپیڑے پڑنے لگے اور آپ اس کی بربادی پر آنسو بہانے لگے۔ یہ آنسو بھی بے قیمت نہیں ہیں۔ دردِ دل کی دلیل ہیں۔ محبت کا ثبوت ہیں مگر وہ بات اپنی جگہ پر قائم ہے کہ ساحل پر کھڑے یہ آنسو بہانا بھی کشتی پر بیٹھنا نہیں ہے۔ پھر کشتی پر بیٹھنے میں کیا ہوتا ہے؟

میری تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ کشتی پر جا کے بیٹھ گئے تو نہ ہماری ذاتی حرکت کچھ ہے، نہ ذاتی سکون، کشتی چلی تو ہم چلے، کشتی رکی تو ہم رُکے۔ بس اب کشتی اہلبیتؑ پر بیٹھنے کے معنی سمجھ میں آ گئے۔ وہ یہ ہیں کہ اپنے حرکت و سکون کو تابع اہلبیتؑ بنا دو جہاں اہلبیتؑ نے قدم آگے بڑھائے ہوں وہاں قدم آگے بڑھاؤ جہاں تک گئے ہوں وہاں قدم روک لو تو یہ ہے کشتی اہلبیت پر بیٹھنا۔ اس صورت میں جہاں کشتی پہنچے گی وہاں ہم پہنچیں گے اس لئے معصومؑ نے ارشاد فرمایا ہے:

فِیۡ دَرۡجَتِنَا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ.

"ہمارے پیرو ہمارے درجہ میں ہوں گے قیامت کے دن۔"

آج کہا جاتا ہے کہ جب ہم محبّ اہلبیت اور مومن ہیں تو ہمیں عبادت و اطاعت کی کیا ضرورت ہے؟

حالانکہ منزل محبت و ایمان میں ہم بریر ہمدانی یا حبیب بن مظاہر یا مسلم بن عوسجہ کے برابر ہرگز

نہیں ہیں۔ کربلا میں تو فرائض انسانی کے تمام شعبوں کو زندہ رکھا گیا، چنانچہ نماز جیسی کربلا میں پڑھی گئی ویسی کبھی نہیں پڑھی گئی۔ دیکھئے! غیر معصومین کا ذوق عبادت بھی کربلا میں کتنا بلند تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ نماز پڑھ رہے ہیں اور تیر ادھر ادھر آ کر گر رہے ہیں تو جناب عباسؓ نے کہا کہ یہ نماز کا موقع ہے؟ حضرت علیؑ نے کہا کہ اے ابن عباس! اسی نماز کے لئے تو ہم جنگ کر رہے ہیں۔

یہاں امام کا عمل سامنے ہے۔ پھر بھی جناب ابن عباس حیرت سے سوال کر رہے ہیں۔ اب ذرا ابوثمامہ صائدی کا ذوق عبادت دیکھئے کہ تیروں کی بارش ہے، ہنگام جنگ اور ادھر نگاہ آفتاب پر ہے فکر ہے کہ امام نہ کہنے پائیں اور ہم اپنے ذوق عبادت کا نذرانہ امام کی خدمت میں پیش کر دیں۔ کہتے ہیں کہ مولا! تمنا یہ ہے کہ یہ نماز آپ کے ساتھ بجماعت ادا ہو جائے۔ ابوثمامہ کے کہنے پر امام دعائیں دیتے ہیں جیسے استاد شاگرد کے مکمل جواب پر خوش ہو کر دعائیں دے:

ذَکَرۡتَ الصَّلٰوۃَ جَعَلَکَ اللّٰہُ مِنَ الۡمُصَلِّیۡنَ الذّٰاکِرِیۡنَ نَعَمۡ ھٰذا اَوَّلُ وَقۡتِھَا.

تم نے خود سے نماز کو یاد کیا۔ اللہ تمہارا اشمار نمازیوں اور یاد رکھنے والوں میں کرے۔

ہاں ہاں یہ اول وقت نماز ہے۔ یہ ہے نگاہِ غیر معصوم کی عصمت جس کی سند امام دے رہے ہیں۔ ظہر کی نماز کس طرح ہوئی۔ سعید و زہیر سامنے کھڑے ہیں۔ تیر آتے ہیں اپنے اوپر روک کر نماز مکمل کراتے ہیں۔ یہ دو قربانیاں صرف نماز کے لئے تھیں۔ ادھر نماز ہو رہی ہے ادھر تیر کھائے جا رہے ہیں۔ کسی کو یہ سمجھنے کا حق نہیں کہ انھوں نے نہیں پڑھی، کون کہہ سکتا ہے کہ تیر کھانے کے لئے جھکے تو رکوع نہیں کیا اور سیدھے ہوئے تو قیام نہیں کیا اور اشاروں سے سجدے نہیں کر لئے۔ ہاں اس جماعت میں شریک نہیں تھے۔ ان کا بھی وہی ذوق عبادت تھا جو ابوثمامہ کا تھا، مگر اطاعت و حفاظت امام مقدم تھی اور اب یہ فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا، کہ ان کی نماز افضل ہے جو مولا کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے یا ان کی جو امام کے آگے کھڑے نماز پڑھنے کے ساتھ ساتھ امام کو نماز پڑھوا رہے تھے۔

ادھر امام نے سلام پھیرا اور سعید زمین پر گرے اور کہا:

اَوۡفَیۡتُ یَا اَبَا عَبۡدِ اللّٰہِ. مولا! کیا میں نے حق وفا ادا کر دیا۔

فرمایا: نَعَمۡ وَفَیۡتَ جَزَاکَ اللّٰہُ خَیۡرًا. ہاں تم نے حق وفا ادا کر دیا۔ اللہ تمہیں جزائے خیر

عطا فرمائے۔

یہ نماز ظہر کا ذکر تھا...... بہت ممکن ہے کہ اسی وقت نماز عصر بھی بجماعت ادا ہوئی ہو کیونکہ سفر اور خوف میں باجماع امت جمع بین الصلوٰتین درست ہے۔ حضرت کے لئے اس وقت دونوں باتیں جمع تھیں۔ مگر ہمارے رہنمایان دین اور معصومینؑ بلاشبہ اوقات فضیلت پر الگ الگ نماز پڑھنے کے پابند تھے چنانچہ کتب مقاتل بتاتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ نے اس کے بعد آخری لمحۂ حیات میں نماز عصر ادا کی۔ مگر اس نماز کی پوری کیفیت بیان کرنے سے میری زبان قاصر ہے۔

بس اتنا کہوں گا کہ اب ذوالجناح کی پشت خالی ہو چکی تھی۔ اب راکبِ دوشِ رسولؐ زمین کے اوپر تھا۔ اس کے بعد نہ کہوں گا کہ رکوع کیونکر ہوا؟ قیام کس عالم میں ہوا؟ بس سجدہ کا ذکر اور اسی پر ختم مجلس۔ یقیناً علیؑ کا سجدہ بھی یادگار تھا۔ ۱۹ ررمضان کی صبح کو جس کا گواہ بعد میں طلوع ہونے والا سورج تھا اور حسینؑ کا یہ آخری سجدہ ہے ۱۰ رمحرم کی عصر کا جس کا گواہ غروب کی طرف مائل ہوتا ہوا سورج ہے۔ مگر میں خود بارگاہ امیر المومنینؑ میں عرض کروں گا کہ یا علیؑ یقیناً آپ کی بھی نماز اور سجدے یادگار ہیں مگر آپ کو سجدہ سے سر اٹھانے کا موقع ملا۔ لیکن حسینؑ نے تو بس سر سجدہ میں دیا۔ وہ اس کے بعد بلند ہوا تو ظالموں کے ہاتھ سے نوکِ نیزہ پر۔

✿✿✿
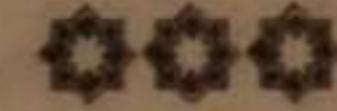
اسلام اور انسانیت

اسلام کا پیغام توحید اور عالمِ انسانیت پر اس کا اثر

اسلامی تعلیمات میں سب سے مقدم چیز توحید ہے یعنی اللہ کو ایک ماننا اسی کے لئے پیغمبر اسلام نے تمام زحمتیں اور مشقتیں برداشت کیں۔

اگر پیغمبرؐ ان جاہل، بت پرست قبائل عرب سے یہ کلمہ پڑھوانا چاہتے کہ "اللّٰہ الہ" تو جتنے قریش تھے، جتنے عرب تھے، جتنی دنیا اس وقت تھی، سب کے سب اس کے لئے آسانی سے تیار ہو جاتے۔ اگر اللہ کو فقط منوانا منظور ہوتا تو جن کا ذوق عبادت تین سو ساٹھ کو مان رہا تھا ان کو تین سو اکسٹھ کے ماننے میں کیا عذر ہو سکتا تھا اور پھر وہ مشرکین عرب اللہ کو مانتے تو تھے ہی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: "لئن سئلتھم من خلق السّموات والارض لیقولن اللّٰہ" اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ نے۔

دوسری جگہ "لئن سئلتھم من خلق السّموات والارض وسخّر الشّمس والقمر لیقولن اللّٰہ" ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے اور شمس و قمر کو کس نے مسخر کیا ہے تو کہیں گے کہ اللہ نے "لئن سئلتھم من انزل من السّمآء ماء فاحییٰ بہ الارض بعد موتھا لیقولنّ اللّٰہ" ان سے پوچھو کہ کون آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس سے زمینِ مردہ کو زندہ بنا دیتا ہے تو کہیں گے کہ اللہ۔ معلوم ہوا کہ مشرکین قریش سے اس بات پر جہاد نہ تھا کہ وہ اللہ کو نہ مانتے ہوں۔ صرف اللہ کے ماننے نہ ماننے کا سوال نہ تھا۔ وہ چیز جو محل اختلاف تھی اور جس نے رسولؐ کے مقابل ان کو صف آرا بنا دیا تھا وہ یہ تھی کہ اسلام کہتا تھا اس کے ایک خدا کے بتلائے ہوئے کے سوا کسی کو نہ مانو، بس یہ غیر اللہ کا نہ ماننا ان کے لئے دشوار تھا۔ اس کا پیغام تھا "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ"